R. No. 218657

Regd. No. 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہمارِی زبان

Tele. No. 29

Telegrams

"ANJUMAN"

قیمت

سالانہ تین روپئے

ایک پرچہ دس

نئے پیسے

تاریخ اشاعت

۱-۶-۶۳

جلد ۲۲ - شمارہ ۲۱	ایڈیٹر - آل احمد سرور	یکم جون ۱۹۶۳ء

مجنوں گورکھپوری

"قمر زمانی"

(ایک یاد)

"اُردو ادب" کا پہلا شمارہ بابت ۱۹۶۳ء ابھی ملا اور آج ہی اتفاق سے "نگار" کا نیاز نمبر ڈاک سے موصول ہوا۔ نیاز نمبر اور "اُردو ادب" میں جناب محمد بشیر الحق دسنوی کے مضمون "رسالہ نقاد آگرہ" کو پڑھ کر لازمی ایتلاف کی بنا پر تقریباً نصف صدی کی گزری ہوئی مدت کی ایک زندہ تصویر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی۔

"رسالہ نقاد آگرہ" میں "قمر زمانی" کا بھی ذکر ہے جو ناگزیر تھا اس لئے کہ ناممکن ہے "نقاد" یا صاحبِ "نقاد" کی یاد آئے، اور "قمر زمانی" کا خیال پیچھے رہ جائے۔ میں بھی دل میں ایک تحریک پا رہا ہوں کہ اس "بلائے جان" کا کچھ تذکرہ کروں جس نے خاص مدت تک شاہد دلگیر کے دل و دماغ کو آوارہ اور بے خانماں رکھا، اور جو پھر "نقاد" کی زندگی کے دوسرے دور میں بغیر سامنے آئے ہوئے اس کی "ترتیبِ تہذیب" میں کار فرما کی حیثیت سے کھیل رہی۔

اس موضوع پر میں جو کچھ کہنے جا رہا ہوں وہ نہ تو میری اپنی اختراع ہے اور نہ اس کی بنیاد مطالعہ اور تحقیق ہے۔ میں یہ حکایت اس لئے چھیڑ رہا ہوں کہ حسن و شباب اور شعر و نغمہ کے جس عہد سے اس کا تعلق ہے اس میں خود میرا لڑکپن سانس لے چکا ہے۔ میں اس حکایت کو کسی زمانہ میں روز سن چکا ہوں اور اس پر جو تبصرے ہوا کرتے تھے ان میں اپنی بساط کے مطابق شریک رہ چکا ہوں۔ اس پر نگاہ بازگشت ڈالتے ہوئے میں وہ لذت پا رہا ہوں جو صرف گزری ہوئی باتوں کی یاد سے مل سکتی ہے۔

گزشتہ ۱۹۱۷ - ۱۸ء کا تعلیمی سال تھا۔ میں ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ پہلی جنگِ عظیم ختم ہو رہی تھی۔ زندگی کے ہر شعبہ میں یہ ایک سرگشتگی اور از خود رفتگی کا زمانہ تھا۔ اُردو ادب میں یہ وہ غنائی دور تھا جس کو رومانی دور کہا جا سکتا ہے اور جو سرسید کے نثری اور افادی دور کا خاموش رد عمل تھا۔ اب اُردو نثر میں وہ مزماری آہنگ پیدا ہو چکا تھا جس نے اس کو اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ شعر سے آنکھیں ملا سکے۔ یہ "شعرِ منثور" اور "ادبِ لطیف" کا زمانہ تھا" اور "صلائے عام"، "زمانہ" "مخزن"، "نقاد" اور "ادیب" اس زمانہ کے وہ ادبی رسالے تھے جو متفقہ طور پر مرکزی ادارے کی حیثیت رکھتے تھے اور اُردو نظم و نثر کو نئے پیمانے پر تربیت دے رہے تھے۔ شاید یہ کہنا دُور از کار نہ ہو کہ اس زمانہ میں شعوری اور نیم شعوری طور پر عورت اور رومان کا تصور زندگی کو ہر اعتبار سے پُر کیف بنائے ہوئے تھا اور عورت کے حوالے سے ساری کائنات حسین اور خوش آیند نظر آ رہی تھی۔

میرے گھرانے میں وہی رسالے آتے تھے جن کے نام اوپر گنائے گئے ہیں اور انھیں کی زیادہ قدر تھی۔ اس کے اور جو اسباب بھی رہے ہوں، لیکن سب سے بڑا سبب مہدی حسن افادی الاقتصادی مرحوم کا اثر تھا جن کی بدولت خاندان میں قریب و دور سبھی کی نظر میں رفعت اور مذاق میں نفاست پیدا ہو گئی تھی۔ میں نے خود ان سے بڑے شدید شعوری اثرات قبول کئے ہیں اور میرے ادبی ذوق کی تربیت میں ان کی تحریروں نے ناقابلِ فراموش حصہ لیا ہے۔

ہاں تو فروری مارچ کے دن تھے۔ طاعون کے جلیے ہم لوگ شہر سے بھاگ کر چھ سات میل کے فاصلے پر ایک پُرفضا گاؤں میں مقیم تھے۔ میرے والد مولوی محمد فاروق صاحب، میرے خسر مولوی محمد افراغ صاحب مرحوم، ان کے صاحبزادے محمد ذکی صاحب مرحوم، سید جمشید علی صاحب، بیگم محمد ذکی، بیگم جمشید علی (یہ دونوں خواتین مہدی حسن افادی کی صاحبزادیاں تھیں دونو کا انتقال ہو چکا ہے)، احمد حسن (مہدی حسن افادی کے

بڑے صاحبزادے جو ان دنوں نویں جماعت میں تھے اور اس وقت کلکٹری سے سبکدوش ہو کر گورکھپور میں ہیں) میں اور خاندان کے اور کئی افراد ایک ہی مکان میں تھے اور بڑی چہل پہل رہتی تھی۔ شام کو جب لوگ اپنے اپنے دن بھر کے کاموں سے فراغت پا کر اکٹھا ہوتے تھے تو سب سے پہلے تو اخباری مسائل پر تبادلۂ خیال ہوتا جس میں نمایاں حصہ والد صاحب لیا کرتے۔ پھر کوئی "طلسم ہوش رُبا" بلند آواز سے پڑھتا اور سب سنتے۔ رات کو کھانے کے بعد والد صاحب بستر پر لیٹ کر "تذکرۂ غوثیہ" سب کو سناتے۔ یہ تو مستقبل مشاغل تھے۔ ان کے علاوہ روز قدیم و جدید شاعروں کے کلام پر بحث و تمحیص ہوتی۔ ادبیات حاضرہ بالخصوص مذکورہ بالا رسائل کے تازہ مضامین اور مضمون نگاروں پر رایوں کا اظہار ہوتا۔

"نقاد" (آگرہ) یوں بھی اُردو کے بڑے مقبول رسالوں میں تھا لیکن اس زمانہ میں اس کی مقبولیت اور اہمیت بہت بڑھ گئی ہوئی تھی۔ سبب یہ تھا کہ کچھ دنوں سے "قمر زمانی" کے نام سے ایک پُر اسرار ہستی کے منظومات اور شعری منثورات "نقاد" میں برابر شایع ہو رہے تھے جو فکر و احساس کی نزاکت اور زبان و بیان کی ندرت کی بنا پر ہر صاحب ذوق کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے تھے۔ اس ہستی نے "نقاد" کے مالک و مدیر شاہ دلگیر کو اس طرح اپنا مبتلا کر رکھا تھا کہ ان کو اس کے سوا دنیا و مافیہا کا ہوش باقی نہیں تھا۔ اب شاہ دلگیر کے جملہ حرکات و سکنات "قمر زمانی" کے تصور کے تابع تھے۔ چنانچہ دو سال کے التوا کے بعد "نقاد" کا دوبارہ اجرا اسی کے اشارے سے ہوا اور اب کے وہ پردے کے پیچھے سے اس کی ادارت میں بھی شریک تھی۔

"قمر زمانی" کے منظومات و منثورات بڑے جاذب ہوتے تھے اور اپنے اسلوب کی دل کشی کی وجہ سے پڑھتے پڑھتے یاد ہو جاتے تھے۔ ہم میں سے اکثر کو اس کی تمام غزلیں اور نظمیں اور بیشتر نثری پارے زبانی یاد تھے۔ آج مجھے ایک غزل کے صرف دو اشعار یاد رہ گئے ہیں:

دل ہو تو چکا ان کا پھر کیسی وفا کیشی
اب درس تغافل دے اے مصلحت اندیشی
کیا پوچھتے ہو کس کو ہے شکوۂ دل ریشی
فرماتے رہو تم تو تجدید ستم کیشی

"قمر زمانی" کون ہیں؟ کہاں کی ہیں؟ ان کے حالات کیا رہے ہیں؟ ان کے جذبات و خیالات میں یہ گداختگی اور انداز بیان میں یہ تاثیر کیسے آئی؟ یہ سوالات نہ جانے کتنوں کے لئے دل کی خلش بنے ہوئے تھے۔ لیکن "قمر زمانی" کی وضع آخر تک ایک رہی۔ یعنی:

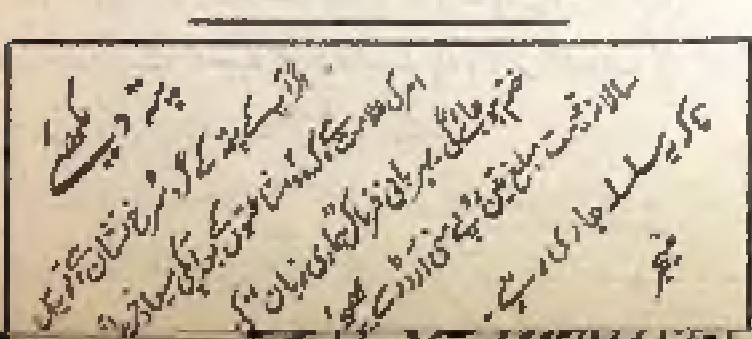
ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

شاہ دلگیر بھی جلووں کی اس شان مستوری سے مستثنےٰ نہیں کئے گئے اور ان سے بھی یہ حجاب قائم رہا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے صرف ایک بار شاید دہلی میں شاہ دلگیر کو حریم ناز کی چوکھٹ پر باریابی نصیب ہوئی اور وہ بھی اس طرح کہ چلمن یا پردہ کے پیچھے سے "دست نگاریں" کی ایک جھلک دکھا دی گئی۔

اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ کسی مرد نے "قمر زمانی" کا روپ دھار کر یہ سارا فتنہ برپا کیا ہے۔ میرا اور بیگم ذکی کا یقین کرنے کو جی چاہتا تھا کہ "قمر زمانی" کوئی عورت ہی ہے۔ بہر حال دوسروں کا جو بھی خیال رہا ہو شاہ دلگیر کو "قمر زمانی" کے عورت ہونے کا ایمان بالغیب کی حد تک یقین تھا۔ وہ بڑا سادہ لوح اور رومان پرور دل رکھتے تھے اور جہاں کہیں رومان کا موہوم سے موہوم امکان ہوتا وہ ذرا سا سہارا پاتے ہی اس کے واقعی وجود کا آنکھ بند کر کے یقین کر لیتے۔ چنانچہ جب مہدی حسن افادی نے ان کو لکھا کہ یہ تو کچھ سوچھوں والی "قمر زمانی" معلوم ہوتی ہیں تو انھوں نے جواب میں کچھ اس مفہوم کی بات کہی کہ ان کو "قمر زمانی" کے وجود کا اسی طرح یقین ہے جس طرح خود اپنے وجود کا۔ مجھے اصل الفاظ یاد نہیں رہے۔ معلوم نہیں ان کا یہ یقین کبھی متزلزل ہوا یا نہیں۔

۱۹۲۹ء میں میں فلسفہ میں ایم۔ اے کرنے لکھنؤ یونیورسٹی میں داخل ہوا اور نیاز اور "نگار" کے پڑوس میں ایک مکان کرایہ پر لے کر رہنے لگا۔ امتیاز احمد اشرفی مرحوم بھی ساتھ رہتے تھے۔ دن میں کئی بار نیاز صاحب کے ساتھ نشست برخاست رہنے لگی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک صحبت میں نیاز صاحب نے مزہ لے لے کر "قمر زمانی" کی سرگذشت تفصیل کے ساتھ سنائی تھی اور مجھے معلوم ہوا کہ نیاز صاحب کی جوانی کیسی شریر اور چنچل رہی ہے۔ مگر جوانی کیوں؟ نیاز صاحب کا بڑھاپا بھی کیا کم چنچل اور شریر ہے۔

نیاز صاحب ابھی زندہ ہیں۔ خدا ان کو زندہ رکھے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ خود اپنی زبان سے لوگوں کو مفصل بتا دیں کہ "قمر زمانی" کی اصلیت کیا تھی اور شاہ دلگیر کو پردہ کی آڑ سے کس نے اپنا ہاتھ دکھایا تھا۔ یہ بھی نیاز صاحب کی زندگی کا ایک شاہ کار ہے۔ اگر نیاز صاحب نے یہ داستان سُنا دی تو وہ عوام کے لئے دلچسپ بھی ہوگی اور اُردو ادب کے مورخین اور محققین کے لئے صحت بخش بھی۔ ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کچھ اور مدت گزر جانے کے بعد اہل تحقیق "قمر زمانی" کے شجرہ، ان کے سوانح حیات، ان کی صورت و سیرت، ان کی پیدائش اور وفات کے سن اور ان کی اولاد کے متعلق اپنے اپنے معلومات اور شواہد فراہم کرنے لگیں اور سوت نہ کپاس جولاہوں سے لٹھم لٹھا شروع ہو جائے۔ نیاز صاحب اردو ادب کی تاریخ کو اس خطرے سے بچا سکتے ہیں۔ خدا کرے نیاز صاحب کی سمجھ میں یہ بات آ جائے۔



قاعدہ میں اچھا نام پیدا کیا ...

ہماری زبان

یکم جون سنہ ۱۹۶۳ء

لسانی فارمولے کے سلسلے میں ضروری کارروائی

انجمن کی مجلس عام نے ۲۲ مئی کے جلسے میں یہ طے کیا ہے کہ انجمن کا ایک وفد لسانی فارمولے کے نفاذ کے سلسلے میں مرکز اور اُتر پردیش کے متعلقہ افسروں سے ملے۔ اس سلسلے میں ایک میمورنڈم بھی تیار ہو رہا ہے۔

ریاستی شاخوں کو چاہیئے کہ ابھی سے اپنی مقامی شاخوں کو خبردار کر دیں اور اُردو دوستوں کو توجہ دلائیں کہ وہ مادری زبان اُردو کے علاوہ علاقائی زبان اور اگر علاقائی زبان ہندی ہے تو ہندی کے علاوہ کوئی دوسری زبان ہندی یا انگریزی لیں۔ جدید ہندوستانی زبانوں کے ذیل میں اُردو بھی آتی ہے، اس لئے اگر مادری زبان اور علاقائی زبان میں سے ایک کو لینے میں اُردو چھوٹتی ہے تو جدید ہندوستانی زبانوں کے ذیل میں اُردو ضرور لینی ہے۔ اس لئے ہر اس علاقے میں جہاں اُردو بولنے والوں کی قابلِ لحاظ آبادی ہے اُردو کی تعلیم کا انتظام ضروری ہے۔ اس وقت غالباً نئے اُستادوں کی ضرورت نہیں پڑے گی، کیونکہ خاصی تعداد میں اُردو کی ضروری لیاقت رکھنے والے اساتذہ موجود ہیں، مگر کتابوں کا انتظام فوراً کرنا چاہیئے۔ اس سلسلے میں نہ تو یہ سمجھنا چاہیے کہ اُردو کو کاٹ دیا گیا اور نہ فرض کر لینا مناسب ہوگا کہ اُردو کا انتظام ہو گیا۔ جدید ہندوستانی زبانوں میں تیرہ زبانیں ہیں۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ کچھ جگہوں پر اُردو کی بجائے دوسری زبانوں کی تعلیم کا انتظام ہو۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ جہاں جہاں ضرورت ہے اُردو کی تعلیم کا انتظام کرائیں۔ اس سلسلے میں جلسوں اور جلوسوں سے زیادہ متعلقہ اشخاص سے ملنے، ان کے سامنے اعداد و شمار پیش کرنے اسمبلی اور پارلیمنٹ کے اراکین سے مدد لینے اور قومی کارکنوں کا تعاون حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔

اب تک اُردو کے کئی اخبار یہ خطرہ ظاہر کر چکے ہیں کہ اردو کے لئے کچھ نہیں ہونے والا۔ یہ پست ہمتی کی بات ہے۔ ہر ہے کہ ہمیں ہر قدم پر متعلقہ لوگوں کو توجہ دلانی پڑے گی اور اعداد و شمار کے ساتھ اپنا کیس پیش کرنا پڑے گا۔ ہر جگہ خود بخود اُردو کا انتظام ممکن ہے نہ کیا جائے۔ ہاں یہ یقین ہے کہ اگر توجہ دلائی جائے گی تو فارمولے کا نفاذ اس طرح ہوگا کہ اُردو بولنے والے اُردو ضرور لے سکیں گے۔ اس سلسلے میں دشواریاں ہوں تو ریاستی شاخ کو مرکز کو اطلاع دینی چاہیے۔ یہ مسئلہ ہماری فوری توجہ کا محتاج ہے۔

انجمن کی مختلف کمیٹیوں کے جلسے

انجمن کی مجلس عام، مجلس عاملہ، ادبی کمیٹی اور مالی کمیٹی کے جلسے ۲۲ مئی کو پنڈت ہردے ناتھ کنزرو صدر انجمن کی صدارت میں ہوئے۔ ۲۱ مئی کو رسم خط کمیٹی، شاخوں کے قواعد پر ترمیم کی کمیٹی اور کرپلانی رپورٹ پر غور کرنے کے لئے کمیٹی کے جلسے ہوئے۔

ان جلسوں میں حسب ذیل ممبران شریک ہوئے:

ڈاکٹر سید عابد حسین، پنڈت سندر لال، پروفیسر رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر گیان چند، حیات اللہ انصاری صاحب، بیگم سلطانہ حیات صاحبہ، اوم پرکاش موہلہ صاحب، ایس کے ساہنی صاحب، مفتی عتیق الرحمٰن صاحب، الطاف احمد خیری صاحب، گوپی ناتھ امن صاحب، بیگم حمیدہ سلطان صاحبہ، سید سجاد ظہیر صاحب، فضل الرحمٰن صاحب، پروفیسر آل احمد سرور صاحب، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب پروفیسر آر ڈی ضیاء صاحب۔

خاص خاص امور جن کے متعلق فیصلے ہوئے یہ ہیں:

(۱) لسانی فارمولے کے نفاذ کے سلسلے میں اُردو کے حقوق کی نگہداشت کے لئے ایک میمورنڈم تیار کیا جائے، اور صدر انجمن اس سلسلے میں ایک وفد کے ساتھ مرکز اور اُتر پردیش کے ذمہ دار اشخاص سے ملیں۔

(۲) ایسوسی ایٹ ممبروں کی مد حذف کر کے پانچ ریاستی شاخوں کے نمائندے صدر انجمن مجلس عام کے لئے نامزد کریں۔ اس سلسلے میں دستور میں ضروری ترمیم کی جائے۔

(۳) ریاستی شاخیں چاہیں تو دہلی، بمبئی، کلکتہ میں پارلیمانی حلقوں کے لحاظ سے مقامی شاخیں قائم کریں۔

(۴) انجمن رسالہ سائنس دوبارہ جاری کرے۔

(۵) اُردو ادب کا ایک شمارہ تخلیقی ادب کے لئے وقف کیا جائے۔

(۶) املا اور رسم الخط میں ضروری اصلاحات کے لئے ایک ورکنگ پیپر تیار کیا جائے جس پر اگلے جلسے میں غور ہو۔

(۷) دہلی میں زمین جلد سے جلد حاصل کر کے دفتر کے لئے وہاں نئی عمارت تعمیر کرنے کے لئے نقشے تیار کرائے جائیں۔

جلسوں کی مفصل روداد
علیٰحدہ شائع کی جائے گی

آل احمد سرور

ڈاکٹر ہادی حسن

بچپن میں مولوی اسماعیل کی کسی کتاب میں یہ شعر پڑھا تھا ؎

تا سحر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

۲۳ مئی کی شام کو جب اچانک یہ خبر ملی کہ ڈاکٹر ہادی حسن کا انتقال ہو گیا تو بے ساختہ یہ شعر زبان پر آ گیا۔

ہادی صاحب عرصے سے بیمار تھے۔ جب ملاقات ہوتی اور میں خیریت دریافت کرتا تو وہ ہمیشہ مایوسی کے کلمے زبان پر لاتے۔ ہم لوگ اسے بھی اُن کی ایک "ادا" سمجھتے تھے۔ کچھ دن ہوئے وہ بیماری کی حالت میں سیدنا طاہر سیف الدین چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے داعی ہونے کی جوبلی میں شرکت کرنے بمبئی گئے تھے۔ غالباً ایک ہفتے پہلے وہ اسپتال پہنچے۔ اُن کی تکلیف کو دیکھ کر ڈاکٹروں نے اسٹریچر کا انتظام کرنا چاہا۔ بولے۔ یہ ضرورت سے ایک ہفتہ پہلے کیوں۔ سات آٹھ دن کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

ہادی صاحب کو سب سے پہلے میں نے ۱۹۳۱ء میں آگرے کے ایک مباحثے میں دیکھا۔ علی گڑھ سے خواجہ غلام السیدین مباحثے کی صدارت کرنے آئے تھے۔ اُن کی تقریرِ دلپذیر کے بعد ہادی صاحب کی تقریر ہوئی۔ ہم سب کالج کے نوجوان اُن کی خطابت سے بہت متاثر ہوئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ایک دریا ہے جو بڑی شان و شوکت سے بہہ رہا ہے۔ وہ جب چاہتے لوگوں کو اپنے برمحل فقروں سے ہنسا دیتے اور جب چاہتے اپنی اداکاری سے مسحور کر دیتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پورے ہال میں ہزار سے زیادہ طلبہ رہے ہوں گے مگر سب سانس روکے ہوئے ہادی صاحب کی گہر افشانی سن رہے تھے۔

۱۹۳۲ء میں علی گڑھ آیا تو یونین کے جلسوں میں تقریریں کرنے لگا۔ اس سال تقریر کا فن سکھانے کے لئے ایک کلاس یونین میں کھولا گیا۔ اس میں غلام احمد مدنی، انصار ہروانی، میں اور کچھ اور طلبہ بھی شامل ہوئے۔ پہلے دن ہادی صاحب نے ہم سب سے کچھ پڑھوا کر سنا۔ ایک سر پھرے نوجوان انگریزی غلط پڑھتے تھے۔ ہادی صاحب نے اُن کو اصلاح دینی شروع کی اور ہم سب سے بے نیاز ہو گئے۔ آخر ہال میں صرف ہادی صاحب اور وہ نوجوان رہ گئے، ہم سب بھاگ کھڑے ہوئے۔ اُس کے بعد سے نہ ہادی صاحب آئے نہ ہم لوگوں کو ہی اس کی توفیق ہوئی کہ انھیں پھر تکلیف دیتے۔

کچھ دن کے بعد ہادی صاحب نے اپنے سفرِ ایران پر ایک لکچر دیا۔ لکچر میں ایران کے متعلق معلومات کم تھیں، مگر ہادی صاحب کے تاثرات نے اسے نہایت دلچسپ بنا دیا تھا۔ ہادی صاحب تقریر کے فن کی ساری باریکیاں جانتے تھے۔ اداکاری میں بھی اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ غضب کا حافظہ پایا تھا۔ کبھی فی البدیہہ شعر نہیں کہتے تھے، ہر مصرع بڑی کوشش و کاوش، بڑے ریاض کا ثمرہ ہوتا تھا چنانچہ اس میں بڑی ہمواری اور روانی ہوتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا ایک دریا ہے جو اُمڈا چلا آتا ہے۔

اُس کے بعد ہادی صاحب کے ایرانی تصوف، فارسی طنز و مزاح، ہندو فلسفہ، ہندوستانی تہذیب، مغل فنِ حرب اور دوسرے موضوعات پر بہت سے لکچر سننے کا اتفاق ہوا۔ شکنتلا کے ڈرامے کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا اور خود ہی اسے سناتے تھے۔ مختلف آوازوں اور لہجوں کی بڑی اچھی نقل اُتارتے تھے۔ لکچروں میں اکثر فقرے اور اقوال دہراتے بھی تھے، مگر اُن کا جادو ہمیشہ کارگر ہوتا تھا۔

وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں فارسی کے پروفیسر تھے۔ جدید فارسی ایرانیوں کی طرح بولتے تھے۔ انگریزی انیسویں صدی کی ہوتی تھی، مگر ہوتی بڑی رنگین اور مرصع۔ یونیورسٹی میں کوئی مہمان آتا تو اکثر خیر مقدم یا شکریے کی خدمت ہادی صاحب انجام دیتے۔ مہمان کبھی کبھار اُن کے زورِ خطابت سے مسحور نہیں مبہوت ہو جاتا تھا۔ ایک واقعہ اس وقت یاد آ گیا۔

جان سارجنٹ کو ہم لوگوں نے خاص طور پر اسٹاف ایسوسی ایشن میں سارجنٹ اسکیم پر تقریر کرنے کے لئے بلایا تھا۔ اس زمانے میں یہاں انڈین ہسٹاریکل کانگریس کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ پروگرام یہ رکھا گیا تھا کہ پہلے اسٹاف ایسوسی ایشن کے زیرِ اہتمام سارجنٹ کی تقریر ہو اس کے بعد ہسٹاریکل کانگریس کے زیرِ اہتمام ہادی صاحب منگولوں کے طریقۂ جنگ پر اظہارِ خیال کریں۔ سارجنٹ چاہتے تھے کہ تقریر کرنے کے فوراً بعد روانہ ہو جائیں۔ کار کا انتظام ہو گیا تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر آپ کے پاس تھوڑا سا وقت ہو تو ہادی صاحب کی تقریر سنتے جائیے۔ آپ بہت محظوظ ہوں گے۔ کچھ سرکجبیں ہو کر کہنے لگے، میں "یہاں محظوظ ہونے نہیں آیا ہوں"۔ میں خاموش ہو گیا۔ اِدھر اُن کی تقریر ختم ہوئی اُدھر حیدر خاں صاحب نے جو سکریٹری تھے شکریہ ادا کرنا شروع کیا۔ اب ہادی صاحب اُٹھے اور اسٹیج پر ایک نقشہ ٹانگنے لگے۔ اس زمانے میں ہٹلر کی دو طرف سے مار (Pincer movement) کا بہت شہرہ تھا۔ ہادی صاحب نے نقشے میں چنگیز خاں کی ایسی کئی لڑائیاں دکھائی تھیں۔ سارجنٹ اُٹھنے کی تیاری کر رہے تھے کہ ہادی صاحب نے تقریر شروع کر دی۔ شروع کے چند فقروں پر ہی سارے ہال میں قہقہے گونجنے لگے۔ سارجنٹ ٹھٹک کر رہ گئے۔ میں نے انھیں یاد دلایا کہ کار حاضر ہے، مگر اب ہادی صاحب کا جادو اُن پر چل چکا تھا۔ اُٹھے اور پھر بیٹھ گئے اور جب تک تقریر ختم نہ ہوئی، اپنی جگہ سے نہ ہلے۔

(باقی صفحہ ۹ پر)

اسرار اکبر آبادی

خواب

چاندنی کی چھاؤں میں
کیف زا فضاؤں میں
روشنی کی پیناریں
خواب میں ابھرتی ہیں
اور اُن کے پیچھے ہی
برف کے پہاڑوں پر
سُرخ سُرخ رنگوں کی
بدلیاں سی اُڑتی ہیں
اور کوئی بستی میں
دور کے ڈھلانوں پر
اپنے نرم ہونٹوں سے
بانسری بجاتا ہے
نغمگی لُٹاتا ہے
کائنات گاتی ہے
زندگی کی راہوں کو
دل نشیں بناتی ہے
وہ بھی پاس آتے ہیں
میرا دل لُبھاتے ہیں
دل فریب باتوں سے
رنج و غم بھلاتے ہیں
لیکن اُن کو پاتے ہی
نیند ٹوٹ جاتی ہے
اُٹھ کے بیٹھ جاتا ہوں
خود ہی مسکراتا ہوں
اور دل سے کہتا ہوں
خواب ہی سہارا ہے
حسرتوں کے ماروں کا

سلام بن رزاق پنویلی

ہم آفتاب ہیں

وہ دیکھو دیس میں ہر سمت زہر پھیل گیا
وہ سُرخ ناگ اُٹھے اپنے پھن اُٹھائے ہوئے
کھڑا ہے ہند کی سرحد پہ پست قد فتنہ
زباں پہ رام بغل میں چھری دبائے ہوئے

یہ جاں تو کیا ہے چمن پہ ہزار جاں قرباں
کرو دو جہاں بھی لٹا دیں گے اس چمن کے لئے
قدم قدم پہ جلائیں گے ہم لہو کے چراغ
قدم قدم پہ بہائیں گے خون وطن کے لئے

چلو کہ سر سے کفن باندھ کے چلیں گھر سے
چلو کہ آج صداقت پہ جان دینا ہے
چلو کہ توڑ کے رکھ دیں غرور کے پیکر
چلو کہ قوت بازو سے کام لینا ہے

اُٹھو تو اس طرح اُٹھو کہ ظلم کانپ اُٹھے
کہ قاتلوں کے بھی ہاتھوں سے تیغ گر جائے
چلو تو اس طرح مستی میں رقص کرتے چلو
زمیں تو خیر زمیں ہے فلک بھی تھرائے

شکست ہوگی یقیناً ستم شعاروں کو
غرور خاک میں مل جائے گا یزیدوں کا
ہر ایک خون کے قطرے سے حشر اُٹھے گا
کہ رنگ لائے گا اک دن لہو شہیدوں کا

چمن کو سینچیں گے خونِ جگر سے ہم اپنے
کلی کو حسن گلوں کو شگفتگی دیں گے
ہمارے سینوں میں فانوس یا عزم روشن ہے
ہم آفتاب ہیں دُنیا کو روشنی دیں گے

غزلیں

آفتاب شمسی

ہم نے مانگی ہر خوشی کی [illegible] جو بھول چلے تھے — ذہن جب [illegible] تھا جب ذرا خیال آیا
ایک غم ہی تھا اُن کا جس پہ ناز تھا ہم کو — وہ بھی اُن کے قدموں میں ہو کے پائمال آیا
پھر گھٹا اندھیرا ہے پھر غموں نے گھیرا ہے — دل کسی کی محفل سے آج پھر نڈھال آیا
چارہ گر ہوئے قاتل راہبر بنے رہزن — زندگی میں یہ بھی [illegible] دور بے مثال آیا
یوں غمِ جہاں پا کر آج خوش ہوئے شمسی — جیسے بعد مدت کے کوئی ہم خیال آیا

قوی فائزی ٹونکی

ابتدائے عشق ہے حسرت کے افسانے کا نام — منتہائے ہجر غم میں غرق ہو جانے کا نام
چشمِ ساقی کا سہارا کچھ نہ [illegible] ہے — اس لئے ہم نے رکھا پیمانہ پیمانے کا نام
میرے افسانے کا عنوان بن جائیں اگر — حشر تک [illegible] ہے پھر میرے افسانے کا نام

صلاح الدین نیر

ہر قدم پر ہے مشکل تازہ — جب سے بکھرا ہے دل کا شیرازہ
آرزو فصل [illegible] کی کون کرے — [illegible] ہے جب ترد تازہ
ڈوبتے ڈوبتے ستاروں نے — چہرۂ شب پہ مل دیا غازہ
جب تبسم پہ سمت [illegible] نیر — کس کو ہے میرے غم کا اندازہ

واحد پریمی

آندھیاں دُشمنی رہیں اور رنج و غم آتے رہے
منزلوں کی سمت لیکن کارواں جاتے رہے
[illegible] چھپتے رہے ہر لمحہ غم کی [illegible]
ہم مگر اے زندگی تیرے [illegible] گاتے رہے
مرحبا جذبہ جنوں ہر گوشۂ زنداں میں ہم
اپنی چشم آرزو سے پھول برساتے رہے

مراسلات

اُردو کے لئے سب سے بڑا مسئلہ

اُردو کو کسی خطے کی علاقائی زبان منوانے کی تحریک اس میں شک نہیں کہ ایک بڑی اہم تحریک ہے اور یہ کہ اس کو کسی نہ کسی جہت سے برابر تازہ رکھنا ضروری ہے۔ امتحانات میں اُردو کے ذریعے غیر لسانی مضامین کے سوالات کا جواب دینے کی سہولت ہمیشہ ہمیشہ برقرار رکھنے کا مطالبہ ہمارا فطری و جمہوری حق ہے اور ہم اس پر جتنا بھی اصرار کریں کم ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے ماہیت قلب کے بعد کم از کم جامعہ ملیہ جیسی درس گاہوں میں اُردو کو اول تا آخر ذریعۂ تعلیم بنوانے کی مہم ایک نہایت ضروری مہم ہے اور ہم اس کے لئے جتنی بھی کوشش کریں بالکل صحیح ہے۔ اردو کے پیدائشی رسم خط کو فنا یا مسخ کرنے کی جو سازشیں ہو رہی ہیں ان سے اُردو کو بچانا اور ان کی شدید مذمت کرنا ہم پر لازم ہے۔ اُردو کو غیر ملکی یا ہندی کی ذیلی بولی قرار دینے والے بیانات پر احتجاج ہونا ہی چاہیے۔

اسی طرح یونیورسٹیوں اور کالجوں میں ایم اے اور بی اے آنرز کی اُردو تعلیم کے لئے سعی و جہد انتہائی معقول ہے۔ سہ لسانی فارمولے میں اُردو کے لئے گنجائش نکالنی از حد ضروری ہے۔

لیکن اس وقت جو مسئلہ اُردو کو درپیش ہو گیا ہے وہ مذکورۂ بالا تمام مسئلوں سے بڑا ہے۔ اس لئے کہ در اصل یہی وہ بنیاد ہے جس پر دوسرے مسئلے منحصر ہیں۔ یہ وہ مسئلہ ہے جس کے حل سے ہندوستان میں اُردو کا وجود وابستہ ہے۔ اگر بروقت اس مسئلے کا حل دریافت نہیں کر لیا گیا تو ہماری زبان کے دوسرے تمام مسئلے خود بخود مٹ جائیں گے۔ اس وقت اُردو کی جڑ پر کلہاڑی لگائی جا رہی ہے۔ اگر غفلت میں جڑ کو کٹ جانے دیا گیا تو ظاہر ہے کہ شاخیں اور پتے از خود سوکھ گریں گے۔

یہ صورت حال جبری ابتدائی تعلیم کے نفاذ سے پیدا ہوئی ہے جو بجائے خود ایک مستحسن اور مفید اقدام ہے، لیکن پچھلے تجربات کی روشنی میں یہ مفید اقدام بھی نئے خطروں کو جنم دے رہا ہے۔ معاملے کی پیچیدگی کا ذرا تجزیہ کر لیجئے۔ ہر بچے کے لئے لازم ہوگا کہ وہ سرکار کے زیر سرپرستی اداروں میں داخل ہو کر تعلیم حاصل کرے۔ ابتدائی تعلیم کے یہ ادارے موجودہ سکنڈری اسکولوں سے علاحدہ ہوں گے۔ ان کا ایک خاص اور مستقل نظام ہوگا۔ اب اس بات کو واقعاتی پس منظر میں دیکھئے۔ سکنڈری اسکولوں کے نظام تعلیم میں مادری زبان اُردو کے لئے پہلے سے گنجائش اور اہتمام ہوتا چلا رہا ہے۔ برس ہا برس کی محکم روایت ہے کہ اُردو کی تعلیم کے لئے حسب ضابطہ تین معلم بحال کئے جاتے ہیں؛ ہیڈ مولوی، سکنڈ مولوی اور گریجویٹ اُردو ٹیچر (فارسی و عربی کی تعلیم بھی اسی میں شامل ہے) لیکن اس جمی ہوئی روایت کو بڑی تیزی اور بے دردی سے پیہم کُترا جا رہا ہے۔ گریجویٹ اُردو ٹیچر کی جگہ تو عملاً گویا ختم ہی کر دی گئی ہے۔ دو مولویوں کے سر پر بھی تلوار لٹک رہی ہے اور بیشتر اسکولوں میں فقط ایک ہی سے کام چلایا جا رہا ہے۔ بعض نئے قائم ہونے والے اسکول ایسے بھی ہیں جہاں اُردو مدرس نام کی کوئی چیز ہوتی ہی نہیں۔ پرانے اسکولوں میں بھی نہ صرف یہ کہ سکنڈ مولوی کو عام طور پر حکماً رخصت دیا جا رہا ہے بلکہ بعض جگہ قسم قسم کے حیلوں بہانوں سے، کبھی تعداد کی کمی کے لئے سازش کر کے اور کبھی مالیات کی کمی کا عذر لنگ پیش کر کے، ہیڈ مولوی پر بھی زد ڈالی جا رہی ہے۔

ایسے ماحول میں کھلی ہوئی بات ہے کہ نئے قائم ہونے والے ابتدائی اسکولوں میں حتی الامکان اُردو کو بار نہیں ملنے دیا جائیگا۔ اسکول کے منتظم اور حاکم اپنی حد تک انتہائی کوشش کریں گے اس بات کی کہ لوئر اور اپر پرائمری سے مڈل تک اُردو کی کسی حیثیت سے تعلیم کے لئے کوئی موقع فراہم نہ کیا جائے۔ اب غور کیجئے کہ آپ کے بچے کو ان ہی اسکولوں میں داخل ہو کر تعلیم حاصل کرنا لازم ہے۔ لامحالہ وہ غریب اُردو سے نابلد رہے گا۔ چنانچہ مڈل پاس کرنے کے بعد جب آپ اُسے کسی سکنڈری اسکول میں لے جائیں گے تو داخلے کے فارم پر مادری زبان کے خانے میں آپ دفعتہً محسوس کریں گے کہ "اُردو نہیں لکھ سکتے" اس لئے کہ بلند اقبال نے اُردو نام کی کوئی زبان اب تک پڑھی ہی نہیں، وہ اُردو رسم خط کے حروف سے بھی آشنا نہیں۔ ظاہر ہے کہ جس مستقبل کی تابانی کے لئے آپ نے اب تک بچے کو اُردو سے ناواقف محض رکھا ہے اس کو مادری و تہذیبی زبان وغیرہ جذباتی کمزوریوں پر قربان نہیں ہونے دیں گے۔ کانپتے ہاتھوں سے (اگر ایسا کچھ احساس بھی اس وقت تک زندہ رہ جائے) آپ کا قلم اُردو خانے سے گزر کر کسی اور دائرے میں حرکت کرنے لگے گا۔ اسی طرح ہائر سکنڈری کے بعد کالج اور کالج کے بعد یونیورسٹی میں اُردو کی کلاسیں ویران ہوتی چلی جائیں گی۔ یہاں تک کہ یہی اُردو ناآشنا نسل جب زندگی کے وسیع میدان میں قدم رکھے گی تو اس کے سامنے کوئی لسانی مسئلہ نہیں رہ جائے گا، ہر پہلو سے یک جہتی کا عمل مکمل ہو جائے گا!

اُردو زبان کی تاریخ میں اس سب سے نازک اور پیچیدہ مسئلے کے حل کی دو صورتیں بروقت ہمارے سامنے ہیں۔ اول یہ کہ حکومت نے ابتدائی تعلیم کے دائرے میں اُردو کے لئے جو دستوری گنجائش چھوڑ دی ہے اس سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا جائے، ہر ممکن آئینی طریقے سے اس بات کی منظم کوشش کی جائے کہ قانون میں مضمر سہولتیں واقعی حاصل ہو جائیں۔ دستوری مراعات کو بروئے عمل لانے کے لئے رائے عامہ کو بیدار کرنے سے سرکاری سطح پر چارہ جوئی تک، تمام جمہوری وسائل کو بے دریغ استعمال کیا جائے۔

دوسری، زیادہ نتیجہ خیز اور قابل اعتبار صورت اپنی مدد آپ ہے۔ اب تک اُردو کے تحفظ و ترقی کے لئے ہماری تگ و دو کا رُخ دوسروں کی طرف رہا ہے، ہم دوسروں سے مطالبے اور مطالبوں کے عدم تعمیل پر احتجاج کرتے رہے ہیں، ہم نے بڑے بڑے ہنگامے اور مظاہرے کئے ہیں۔ جمہوریت میں ان حرکتوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور ان کی جزوی و عارضی

افادیت بھی مسلّم ہے۔ لیکن کوئی شخص اور گروہ اپنی زندگی کے لئے دوسروں پر انحصار کر کے زیادہ دنوں سانس نہیں لے سکتا، اپنی رگوں میں خون اور چہرے پر سُرخی ہے تو دوسرے بھی لحاظ کرنے پر مجبور ہوں گے ورنہ مریض نیم جاں سمجھ کر پائے حقارت سے ٹھکرا دیں گے یا زندگی کی آخری گھڑیاں گننے کے لئے بستر پر لٹا دیں گے۔ چنانچہ دوسروں پر اعتماد کرنے کا بھیانک انجام آج اسی ابتدائی تعلیم کے مسئلے کی شکل میں ہمارے سامنے ہے، علاقائی زبان کا مطالبہ کرتے کرتے اب نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ سرے سے مادری زبان کا وجود ہی غیر یقینی ہو گیا ہے کل تک ریاستی زبان کی بات کرتے تھے، آج زبان ہی کو سنبھالنا پڑ رہا ہے۔ اب وقت آگیا ہے (اور اگر اب بھی نہیں آیا ہے تو پھر کبھی نہ آئے گا) کہ ہم اپنی لسانی جدوجہد کا رُخ پوری تن دہی کے ساتھ اپنی ہی طرف پھیر دیں۔ میرا مطلب ہے تعلیم، کم از کم بنیادی تعلیم کے مسئلے کو اپنے ہاتھوں میں لے لیں، ایک تحریک و تنظیم کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوں اور اپنے بچے کھچے وسایل کو بے دریغ اس مہم میں جھونک دیں۔ اس کی صورت یہ ہوگی کہ ابتداءً کم از کم مڈل تک تعلیم کی درس گاہیں ہم اپنے اہتمام میں قائم کریں، ان میں حکومت کا تجویز کردہ نصاب پورا کا پورا پڑھایا جائے اس امتیاز کے ساتھ کہ ذریعۂ تعلیم اُردو ہو اور اس کے علاوہ چند مضامین غیر رسمی طور پر ایسے پڑھائے جائیں جن کے مطالعہ سے اُردو طلبہ کو اپنے علمی و ادبی سرمائے کو سمجھنے کی استعداد میسّر آسکے" اور اُردو کے وہ طلبہ جو مسلمان ہیں فارسی، عربی، یا اسلامیات کی تعلیم حاصل کر سکیں۔ اس قسم کے مڈل اسکولوں کو دستوری مراعات کے پیشِ نظر بہ آسانی حکومت سے منظور کرا لیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو طلبہ ان اسکولوں سے فارغ ہو کر نکلیں گے وہ علمی و عملی ہر لحاظ سے اُردو کی روایات کو فروغ دیں گے، نسلاً بعد نسلٍ سکنڈری اسکول، کالج اور یونی ورسٹی کے عبوری مرحلوں سے گزر کر زندگی کے وسیع میدان میں بڑھیں گے، اُردو کا علم خاموشی اور مضبوطی سے اُٹھائے چلے جائیں گے

کام کے مذکورۂ بالا دونوں طریقوں کی کامیابی کے لئے ایک باضابطہ منصوبہ بنانا ہوگا، ایک مہم اٹھانی ہوگی، ایک تحریک چلانی ہوگی۔ جدید دور میں میسّر ہونے والے تمام وسائل کو بکار لانا ہوگا۔ مثلاً، سب سے پہلے ایک کل ہند کانفرنس خاص اور صرف ابتدائی تعلیم کے موضوع پر بلائے۔ اس کانفرنس میں ہر ریاست سے کم از کم ایک نمایندے پر مشتمل ایک مجلسِ عمل منتخب کیجئے۔ مجلسِ عمل کے ریاستی نمایندے اپنے اپنے علاقوں میں

اسی طرح کی ایک کانفرنس بلائیں۔ ریاستی کانفرنس ہر ضلع سے کم از کم ایک نمایندے پر مشتمل ایک مجلسِ عمل منتخب کرے۔ اس مجلسِ عمل کے ارکان مقامی کارکنوں کے تعاون سے ہر سب ڈویژن اور سب ڈویژن میں ہر ہر تھانے کا دورہ کریں۔ ہر ہر تھانے میں جلسوں اور تقریروں کے علاوہ فعّال مقامی افراد پر مشتمل ایک مجلسِ عمل بنا دی جائے۔ یہ مجلسِ عمل مقامی رائے عامہ کو ہموار کر کے حسبِ ضرورت و استطاعت لوئر پرائمری، اپر پرائمری اور مڈل اسکول کے قیام کا اہتمام کرے۔ ضلعی اور اس کے اوپر ریاستی اور اس کے اوپر مرکزی مجلسِ عمل تمام اقدامات کی نگرانی کرے اور مقامی کارکنوں کے ساتھ حسبِ ضرورت ہر قسم کا عملی تعاون کرے۔ ابتدائی تعلیم کی اس ہمہ گیر تحریک کے لئے دو ناگزیر کام یہ ہیں کہ کم از کم ہر ریاست کی سطح پر کسی مقررہ تاریخ کو قریے قریے میں یومِ ابتدائی تعلیم منایا جائے۔ دوسرے، ایک معلوماتی و مشورتی کتابچہ اس موضوع پر شایع کر کے ملک کے گوشے گوشے میں تقسیم کر دیا جائے۔

اس تحریک کو چلانے کے لئے ابھی کسی نئی تنظیم کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ انجمن ترقی اُردو ہند کا فرض ہے کہ وہ وقت کے اس اہم ترین مسئلے کو اپنے ہاتھ میں لے اور اس سلسلے میں فوری اقدامات کرے۔

ابتدائی تعلیم کے مسئلے نے ایک بار پھر انجمن ترقی اُردو کو ایک موقع "تگ و تاز" فراہم کیا ہے۔ توقع کرنی چاہئے کہ وہ وقت کی اس للکار کا جواب دے گی، ورنہ وقت اسے پیچھے چھوڑ کر بڑھ جائے گا۔ انجمن ترقی اُردو کے وجود کا جواز ہی یہ ہے کہ وہ پیش آنے والے لسانی مسائل کو اجتماعی سطح پر حل کرنے کی کوشش کرے، یعنی ایک رنگ کی لسانی سیاست سے اس کو نبرد آزما ہونا ہے۔ ورنہ جہاں تک خالص علمی و ادبی سرگرمیوں کا تعلق ہے اس کے لئے دوسرے ادارے ہیں اور اپنی جگہ کام کر رہے ہیں۔ انجمن ترقی اُردو کا اصل نصب العین اور نظام کار لسانی سیاسات کے میدان میں جدوجہد کرنی ہے۔

آخری لیکن سب سے ضروری بات یہ کہ ابتدائی تعلیم کے معاملے میں جو بھی جدوجہد ہو مثبت رویے کے ساتھ تعمیری خطوط پر ہونی لازم ہے۔ کسی دوسرے سے ردوکد اور شور و شر کا انداز اس سلسلے میں مفید نہیں ہو سکتا۔ نہایت امن و سکون کے ساتھ توجہ صرف اُردو درس گاہوں کے قیام پر مرکوز رہنی چاہیئے۔

نوٹ:

اہلِ اُردو کے لئے یہ اطلاع مسرت انگیز ہوگی کہ انجمن ترقی اُردو (ہند) کی مستند ریاستی شاخ، بہار ریاستی انجمن ترقی اُردو نے اپنے ایک حالیہ مشاورتی جلسے میں ابتدائی تعلیم کے مسئلے پر ایک صوبائی کانفرنس بلانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

کان فرنس جون کے اواخر میں منعقد ہو گی۔ اس کے لئے ابھی سے کی بچے وغیرہ کی تیاریاں شروع ہو گئی ہیں۔ دوسری ریاستیں بھی اسی انداز پر کام کر سکتی ہیں۔ مرکز کو بھی چاہئے کہ اس سلسلے میں اپنی ریاستی شاخوں کو ہدایات دے۔ کم از کم مرکزی مجلس عاملہ کا ایک فوری اجلاس اس موضوع پر بلا لیا جائے تو بہتر ہو، جس میں ارکان کے علاوہ ہر ریاست کے اہل الرائے محبان اردو کو شرکت کی خصوصی دعوت دی جائے۔ اس طرح فی الواقع ایک چھوٹی کان فرنس منعقد ہو جائے گی اور پورے ملک میں ابتدائی تعلیم کا کام واضح اور مربوط طریق پر آگے بڑھے گا۔

(عبدالمغنی)

جوش کی دکن سے واپسی

آپ نے یکم مئی کے شمارے میں "جوش کی دکن سے علیحدگی کی وجہ" کے سلسلے میں دو بیانات شایع کئے ہیں۔ اس کے بعد بھی مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مضمون تشنہ رہ گیا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ آپ اس کے بارے میں مزید تحقیق کرائیں۔ اگر کوئی ایسی نظم شایع ہوئی ہے جو اعلیٰ حضرت کی طبع نازک پر گراں گزری ہو تو اسے پورا درج کر دینا چاہئے تاکہ قارئین یہ فیصلہ کر سکیں کہ آیا وہ نظم اسی سلوک کی مستحق تھی یا نہیں۔ پانچوں بیانوں میں خاصا تضاد موجود ہے اور اسے دور کر دینا چاہئے اور اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ بلا رد و رعایت سچے واقعات منظر عام پر آ جائیں۔ حیدرآباد میں آج بھی بہت سے ایسے اشخاص موجود ہونگے جو اس واقعہ کے وجوہ سے پوری طرح واقف ہوں گے۔

(ضیاء الدین احمد برنی)

ایک شعر کی تلاش

انداز ناز بین کہ جگر گوشۂ خلیل
سر زیر تیغ آرد و شورش نمی کند

اس شعر کے علاوہ ایک اور شعر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جگر گوشۂ بتول کے ساتھ سلوک اس کے برخلاف رہا۔ یہ شعر کسی ناظر اخبار کو یاد ہو تو آئندہ کسی اشاعت میں درج فرمائیں۔

(سید غوث محی الدین)

پروفیسر رشید احمد صدیقی کا مراسلہ

بعض کرم فرما میری نجی تحریروں یا خطوط کو جو وقتاً فوقتاً ان کو یا کسی اور کو لکھے گئے، علیحدہ علیحدہ یا مجموعے کی شکل میں نیز میری سیرت و شخصیت و خدمات کو منظر عام پر لانے کی غرض سے اپنے گراں قدر اخبار یا رسالے کے خاص نمبر شایع کرنا چاہتے ہیں۔ جہاں تک پتہ چل سکا ان عزیزوں کو نہایت ادب و اخلاص سے ممانعت و معذرت کے عریضے لکھ دیے کہ اس طرح کا اہتمام میری حیات ہی میں نہیں بلکہ اس کے بعد بھی نہ فرمائیں۔ انھوں نے میری درخواست قبول فرمائی اپنا ارادہ ملتوی کر دیا اور مجھے اپنا گرویدۂ احسان بنایا۔

علاوہ بریں کبھی میری یادگار منانے یا قائم کرنے کے لئے نہ کوئی عام چندہ کیا جائے نہ کوئی خاص عطیہ یک مشت کسی سے وصول کیا جائے۔ لیکن اس کا اندیشہ ہے کہ عام طور پر میری اس خواہش و گزارش کا علم دوسرے عزیزوں اور بزرگوں کو شاید نہ ہو اس لئے آپ کے مقبول عام اور کثیر الاشاعت اخبار یا رسالہ سے اعانت کا خواستگار ہوں اور درخواست کرتا ہوں کہ متذکرہ صدر خطوط یا تحریریں کسی شکل میں نہ شایع فرمائی جائیں نہ کسی اور طرح محفوظ رکھی جائیں بلکہ بہ نظر احتیاط ان کو تلف فرما دیا جائے تاکہ آئندہ کبھی ان کی اشاعت کا امکان باقی نہ رہ جائے۔ اس کے ساتھ یہ بھی گزارش کروں گا، میری اس درخواست کو معرض بحث میں نہ لایا جائے۔

معمولی تبدیلی کے ساتھ جو ناگزیر یا نادانستہ تھی اس مضمون کا عریضہ میں نے دوسرے اخبارات و رسائل کو بھی بھیجا ہے۔ اصل مقصد صرف اتنا ہے کہ نجی کے خطوط یا تحریریں جو میں نے دوسروں کو کسی موقع پر لکھی ہوں وہ کسی حال میں شایع نہ فرمائی جائیں نہ میری زندگی نہ میرے مرنے کے بعد، نہ کبھی خاص نمبر شایع کیے جائیں۔

امیدوار ہوں کہ ہندوستان اور پاکستان کے مقتدر اخبارات و رسائل اس معروضے کو بجنسہٖ ورنہ اس کا خلاصہ شایع فرما کر ممنون فرمائیں گے۔

۲ر مئی سنہ ۱۹۶۳ء — رشید احمد صدیقی

۲۳ر مئی کا اخبار پریس جا چکا تھا اس کے بعد یہ مراسلہ موصول ہوا تھا۔ (ادارہ)

بقیہ

ڈاکٹر ہادی حسن

ہادی صاحب جس کام کو شروع کرتے تھے اس میں جان لڑا دیتے تھے۔ یونی ورسٹی کے طلبہ کو مقابلے کے امتحانوں کی طرف مائل کرنے کا سوال تھا۔ ہادی صاحب نے یہ کام اپنے ذمّے لیا۔ انھیں مشورہ دیتے تھے، پڑھاتے تھے ان کے لئے ہر قسم کی سہولت فراہم کرتے تھے۔ ان کی وجہ سے ایک زمانے میں علی گڑھ کا اس بارے میں ریکارڈ خاصا اچھا ہو گیا تھا۔

پھر ڈاکٹر ضیاالدین نے میڈیکل کالج کے لئے چندہ جمع کرنا شروع کیا اور ہادی صاحب کو چندے کی فراہمی کے لئے سفیر خاص مقرر کیا گیا۔ ہادی صاحب نے سارے ہندوستان کا دورہ کیا۔ والیان ریاست، تاجروں، تعلقہ داروں، سرکاری افسروں، استادوں، متوسط طبقے کے لوگوں، سب سے چندہ وصول کیا۔ اس زمانے میں ان پر ایک خاص کیفیت طاری تھی۔ رقم تیس لاکھ کے لگ بھگ، صرف انھیں کی کوششوں سے فراہم ہوئی۔ بات یہ ہے کہ ہادی صاحب لوگوں کی نفسیات کو خوب سمجھتے تھے۔
اُن کا نشانہ بہت کم خطا کرتا۔ بڑے زندہ دل آدمی تھے۔ عورتوں کے سامنے اُن کے حسن کی تعریف کرتے، لیڈروں کو قوم کی آبرو بتاتے، والیان ریاست کو اُن کے آبا و اجداد کے کارنامے یاد دلاتے۔ کوئی اپنے کو لیے دیتے دکھائی دیتا تو بے لپک کر اس کا بوسہ لے لیتے۔ بس پھر وہ پگھل جاتا۔

ہادی صاحب کا مضمون پہلے بیالوجی تھا۔ جب وہ ۱۹۲۴ء میں علی گڑھ آئے تو باٹنی پڑھانے لگے۔ سنا ہے کہ لاؤسن کی درسی کتاب انھیں زبانی یاد تھی۔ یہ کتاب میں نے بھی بی ایس سی میں پڑھی تھی۔ کچھ دن کے بعد وہ دوبارہ انگلستان گئے اور لندن یونی ورسٹی سے فارسی میں پی ایچ ڈی کیا۔ واپس آ کر وہ فارسی کے شعبے میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ سر راس مسعود کی وائس چانسلری کے زمانے میں نادر شاہ کی دعوت پر ایک وفد جو اقبال، سید سلیمان ندوی اور راس مسعود پر مشتمل تھا، افغانستان گیا تھا۔ ہادی حسن صاحب بھی راس مسعود صاحب کے ساتھ تھے۔ اپنے سفر کے قصّے بڑے مزے لے لے کر سناتے تھے۔

ہادی صاحب نے فلکی اور کاتبی کے دیوان مرتب کئے۔ ایرانی جہازرانی پر مقالہ لکھا۔ فارسی ادب پر مضامین قلم بند کئے۔ فارسی شاعری کے جواہر پاروں کو انگریزی میں منتقل کیا۔ انھوں نے فارسی ادب پر ہندوستان کی بیشتر یونی ورسٹیوں میں لکچر دئے۔ ان کا خط بڑا پاکیزہ تھا۔ کتاب چھپواتے تھے تو ہفتوں پریس والوں کے سر پر سوار رہتے۔ طباعت کی ذرا سی غلطی بھی انھیں گوارا نہ تھی۔

وہ ہر لحاظ سے ایک غیر معمولی آدمی تھے۔ اگر اتفاق سے سفر میں اُن کا ساتھ ہو جاتا تو سارا وقت لطیفوں اور باتوں میں گزر جاتا۔

ایک دفعہ میں لکھنؤ سے اجمیر جا رہا تھا۔ بریلی کے اسٹیشن پر ہادی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اجمیر کی گاڑی میں اُن کی برتھ نیچے تھی اور میری اوپر۔ ہم لوگ کچھ دیر باتیں کرتے رہے پھر سو گئے۔ پچھلی رات میری آنکھ کھل گئی۔ ڈبے میں اندھیرا تھا مگر یہ معلوم ہوتا تھا کوئی مسلسل بڑبڑا رہا ہے۔ کان لگایا تو معلوم ہوا ہادی صاحب اپنا لکچر یاد کر رہے ہیں۔ اس ریہرسل کے بعد دوسرے دن میو کالج میں اصل ڈرامہ بھی دیکھا ایک لفظ بھی ادھر اُدھر نہ تھا۔ یہاں تک کہ جو فقرات کو کھینچ کر ادا ہوا تھا وہ لکچر میں بھی اُسی طرح جڑا ہوا تھا۔

عام طور پر یونی ورسٹی میں ساٹھ سال کی عمر کے بعد لوگ سبک دوش ہو جاتے ہیں۔ ہادی صاحب کا چار سال کے لئے دوبارہ تقرر کیا گیا۔ اُس کے بعد بھی وہ جس طرح بن پڑا یونی ورسٹی کی خدمت کرتے رہے۔ اُن کی بیوی کا انتقال ۱۹۵۰ء میں ہوا۔ اتفاق سے مئی کے مہینے میں۔ بیوی کے انتقال کا انھیں بڑا صدمہ ہوا۔ اس کے بعد سے وہ جیسوں سے گئے۔ گو اپنے کاموں میں برابر لگے رہتے تھے۔ مگر وہ زندگی وہ زندہ دلی نہ رہی تھی۔ ۱۲ اکتوبر ۱۹۶۲ء کو ڈاکٹر ذاکر حسین نے میڈیکل کالج کے پہلے کلاس کا افتتاح ڈاکٹر ہادی حسن سے کر دیا۔ اُس دن اُن کی تقریر میں اگرچہ اگلا سا طنطنہ نہ تھا، مگر بوئے یاسمن باقی تھی۔ میڈیکل کالج کا جب بھی تذکرہ ہوگا تو تین نام ہمیشہ یاد آئیں گے۔ ڈاکٹر ضیاءالدین کا تخیل، ڈاکٹر ہادی حسن کی فراہمی چندہ کے لئے ان تھک کوششیں اور کرنل زیدی کا ناخن تدبیر جس نے اس کے سلسلے میں ہر گتھی کو سلجھایا۔

ہادی صاحب یونی ورسٹی کے قبرستان میں ابدی نیند سو رہے ہیں اور اُن کے ہر نیاز مند کو یہ محسوس ہو رہا ہے۔

خاموش ہو گیا ہے چمن بولتا ہوا

بنسی لال شرما

اردو رسم الخط منظم و مدلل اور صوت کے اصولوں پر مبنی ہے

پچھلے دو مضامین میں حرکات (vowels) پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اگرچہ دس حروف حرکت ان میں شامل کیے گئے ہیں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بنیادی حرکات صرف تین چھوٹی حرکات اَ اِ اُ ہیں۔ دیگر حرکات ان ہی تین کے باہمی میل جول سے بنی ہیں مثلاً آ = اَ + اَ، ای = اِ + اِ، او = اُ + اُ، اے = اَ + اِ وغیرہ

اس مضمون میں سکنات (Consonants) کی جماعت بندی۔ اور طریقۂ تحریر پیش کیا جاتا ہے۔

تمام سکنات (Consonants) دو شکلوں میں لکھی جاتی ہیں۔ ایک پوری شکل جو کہ صرف لفظ کے آخر میں مستعمل ہوتی ہے جیسے آج۔ کل۔ برس۔ ڈک میں ج۔ ل۔ س اور ک دوسری آدھی یا مخفف شکل جو کہ لفظ کے شروع یا درمیان میں لکھی جاتی ہے جیسے لفظ کے شروع میں۔ (م) مس (ج) جس۔ مسلک میں م کی بجائے مـ۔ ج کی بجائے جـ۔ ن کی جگہ پر نـ۔ س کے بجائے سـ۔ ل کی جگہ لـ۔ لفظ کے درمیان میں جیسے بخشش میں ـنـ ـفـ ـشـ۔

تمام سکنات کو مختلف جماعتوں میں رکھا گیا ہے۔ اور اس جماعت بندی میں یہ اصول رکھا گیا ہے کہ تمام ایسے حروف جو کہ ہم شکل ہیں اور دیگر حروف سے ملنے پر ایک جیسی شکل اختیار کرتے ہیں۔ انھیں ایک ہی جماعت میں رکھا گیا ہے۔ یہ مختلف جماعتیں اور ان کی مخفف شکلیں ذیل میں دی جاتی ہیں۔

(۱) ب جماعت پوری شکلیں ب پ ت (ن) ٹ ث ٹ

آدھی شکلیں (الف) بـ یـ پـ نـ تـ ثـ ٹـ

(ب) بـ یـ پـ نـ تـ ثـ ٹـ

(ج) ب ی پ ن ت ث ٹ

(۲) ج جماعت۔ پوری شکلیں۔ ج چ ح خ م

آدھی شکلیں۔ جـ چـ حـ خـ مـ

(۳) س جماعت۔ پوری شکلیں۔ س ش ص ض ط ظ ع غ و ف ق

آدھی شکلیں۔ سـ شـ صـ ضـ طـ ظـ {عـ غـ} و فـ قـ

(۴) ل جماعت۔ ل۔ ک۔ گ۔ ہ۔ د ڈ ذ۔ ر ڑ ز ژ

لـ {کـ گـ} {ہـ} د ڈ ذ۔ ر ڑ ز ژ

(۵) بھاری حروف۔ بھ پھ تھ ٹھ۔ جھ چھ کھ گھ۔ دھ ڈھ ڑھ

عموماً کسی حرف کی آدھی شکل بنانے کے لئے اس کا آدھا گھیرا کاٹ دیا جاتا ہے۔

جیسے ج = جـ۔ م = مـ۔ س = سـ۔ ق = قـ

اس جماعت بندی کا مقصد صرف تحریر کو منظم اور با اصول بنانا ہے۔ مثلاً ایک ہی حرف 'ب' بن میں بـ۔ بچ میں بـ اور لب میں ب شکل اختیار کرتا ہے۔ جماعت بندی میں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ب کس کس جگہ پر بـ بـ ب شکلیں لے گا۔

اصول نمبر ۲۔ ابتدائی ب جماعت (الف) ج جماعت (ب) درمیانی ہ (ہ) اور ھ کے ساتھ (ب) شکل (بـ یـ پـ نـ تـ ثـ ٹـ) اختیار کرتا ہے۔ جیسے (الف) بج نج بچ بخ بحج بح (بحث) نخ (بخت) نخ (نخوت) بم۔ یم۔ تم۔ نم۔ ثم ٹم۔

(ب) بہا۔ نہا۔ یہاں۔ پہاڑ۔ تہاڑ۔ تہمت۔ بہشتی۔ شہم۔

(ج) بھ پھ تھ تھ ٹھ۔

(۲) (الف) س جماعت (ب) کا کل کے ساتھ (د) شکل (بـ یـ پـ نـ تـ ثـ ٹـ) لیتی ہے۔

(۳) بس پس بش نشر تشریف۔ بصیرت۔ نصیب تصویر۔ بضد۔ تضاد۔ بلخ۔ نطفہ۔ پطرس۔ بظاہر نظارہ بعد۔ یعنی۔ نعرہ۔ تعریف۔ بغداد۔ نغمہ۔ تغیر۔ بفائدہ نفع۔ تفریق۔ بقا۔ یقین۔ نقد۔ تقدیر۔

(ب) بچہ۔ بیکا۔ پکا۔ نکال بجل نکل نکلا۔ بگاڑ۔ یگانگت نگاہ۔ بجل نکل بچل۔

(۳) (الف) اپنی جماعت (ب) اور دیگر تمام حروف کے ساتھ (ب) شکل (ب ی پ ن ت ث ٹ) اختیار کرتی ہے۔

(الف) تب۔ بن۔ ثپ۔ نٹ۔ نب۔ بٹ۔

(ب) بل یل نل تل ٹل۔ بک یک پک نک (نکسیر)۔ بد۔ ند۔ تدارک۔ بر پر نر تر ٹر۔

ج جماعت ہم شکل ہے۔ ج* چ* ح* خ* م* نیز یہ پہلے حرف کے ساتھ بائیں طرف کے سرے پر (×) اس جگہ پر ملتی ہے۔ جیسے بج بخ بچ کج مجل سم نم تم کم۔ اس سے پہلے ب جماعت (ب) شکل لیتی ہے۔ دیکھو اوپر ۱۔ الف۔

س جماعت۔ (الف) یہ پہلے حرف کے ساتھ دائیں سرے پر (×) ملتی ہے۔

[×س ×ص ×ط ×ح (ع) ×و ×ف ×ق] جیسے بس جس بشیر کشمیر جشن۔ قطار۔ فطرت۔ نقد۔ فقدان۔ مقدور۔ اس سے پہلے ب جماعت ہمیشہ 'ب' شکل اختیار کرتی ہے۔ دیکھو (۲۔ الف)

نوٹ: س جماعت کے ع غ حروف پہلے حرف کے ساتھ ملنے پر ج جماعت کے ح خ کی طرح شکلیں لیتے ہیں تو ان کا باہمی امتیاز کیسے کیا جائے گا؟۔ جواب: ان دونوں میں فرق صرف یہ ہے کہ ع غ کی ح خ شکلیں پہلے حرف سے دائیں طرف ملتی ہیں اور ج ج کے ح خ حروف بائیں طرف۔ جیسے

ع غ کی ح خ شکلیں۔ مع۔ مانع۔ تعریف۔ بغداد۔

ج ج کے ح خ حروف۔ مح (محل) نخ۔ تحریک۔ بخت۔

ل ک گ۔ د ڈ ذ۔ ر ڑ ز ژ ہم شکل حروف ہیں۔ ان کی مخفف شکلیں بھی ایک جیسی ہیں جیسے ل ک گ۔ د ڈ ذ۔ بدھ بڑی بڈھا۔ بر یر نر تر اثر۔

نوٹ: ک گ آگے آنے والے آ اور ل کے ساتھ گول شکل کو حاصل کرتے ہیں۔ جیسے کا گا، کل گل۔

ہ حرف بذات خود ایک علیٰحدہ جماعت بناتا ہے کیونکہ یہ مختلف جگہوں پر مختلف شکلیں اختیار کرتا ہے۔ جیسے
(ا) لفظ کے شروع میں (ہ)۔ ہٹ ہل ہنس ہار ہا تھ۔ ہم
(ب) لفظ کے درمیان (ہ)۔ بہا کہا بہت چہار۔ جہلم
(ج) لفظ کے آخر میں ملی ہوئی۔ (ہ)۔ یہ بہ نہ تہ شہ۔
(د) لفظ کے آخر میں علیٰحدہ۔ ہ۔ دہ رہ وہ آہ۔
(ہ) صرف بھاری حروف بنانے کے لئے۔ ھ۔ بھ کھ دھ ٹھ۔

نوٹ ۱: اردو میں ہ کی ھ شکل صرف بھاری حروف بنانے کے لئے مخصوص ہے اس لئے اسے (ہ) کے بدل کے طور پر استعمال کرنا ٹھیک نہیں۔ جیسے ہے نہ کہ ھے۔ دہلی نہ کہ دھلی۔

نوٹ ۲: ب جماعت میں یہ حرف باآواز پ (پپ-प) شامل کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ حرف اگرچہ روائتی ابجد میں شامل نہیں تھا لیکن یہ یار یورپ جیسے الفاظ میں مستعمل ہوتا تھا۔ مبتدی ان الفاظ میں اس حرف کو دیکھ کر پریشان ہوتے تھے کہ یہ کہاں سے ٹپک پڑا۔ دیگر اس حرف کی ب جماعت میں شمولیت نے ایک تنظیم پیدا کر دی ہے۔ کیونکہ پہلے تین حروف بترتیب ایک نقطہ۔ دو نقطے اور تین نقطے نیچے رکھتے ہیں (ب یہ پ) اور اگلے تین حروف اسی ترتیب سے نقطے اوپر رکھتے ہیں (ن ت ث)۔

اُردو تحریر میں 'و' اور 'ی' حروف دونوں ہی بطور حرف ساکن اور بطور حرف حرکت استعمال میں آتے ہیں جیسے و بطور ساکن۔ وقت۔ وسط۔ وہ۔ و بطور حرکت دو' سو' لو' میں۔ اسی طرح ی بطور ساکن جیسے یک' یار' یہ' میں۔ اور ی بطور حرکت جیسے دیر' شیر' دیکھ' میں۔ ان کا امتیاز کیسے کیا جا سکتا ہے؟

اصول نمبر ۱۔ حروف و اور ی اپنے متوازی انگریزی حروف w اور y کی طرح جب لفظ یا لفظ کے جزُ کے شروع میں آتے ہیں یا ان کے آگے کوئی حرف حرکت ہو۔ تو یہ دونوں بطور حرف ساکن مستعمل ہوتے ہیں۔ اور ان سے علاوہ کسی اور صورت میں بطور حرف حرکت۔ جیسے و بطور ساکن باآواز و (w - व)
(ا) لفظ کے شروع میں۔ ور۔ وقت۔ وار۔ وہ۔
(ب) جزُ کے شروع میں۔ سوار۔ (سہ + وار) جواب (جہ + واب) سویر۔ (سَہ + ویر) میں
(ج) جب اس کے پیچھے کوئی حرکت آئے۔ کوارٹر (quarter) Swim - سوم
دیگر سب جگہ بطور حرف حرکت۔ جیسے سو۔ دو۔ رو۔ فوج۔
یوں ہی میں اسی طرح ی بطور ساکن باآواز یٰ (ya - य)
(ا) لفظ کے شروع میں جیسے یک یار۔ یورپ۔ یہ ہیں۔
(ب) جزُ کے شروع میں جیسے کیا (کہ + یا)۔ نیا (نہ + یا) دیا (دہ + یا) وغیرہ میں۔ (ج) جب اس کے بعد کوئی حرف حرکت آئے۔ جیسے کیا؟ کیوں۔ نیاہ۔ بیاہ۔ پیاز۔ دیگر سب جگہ بطور حرف حرکت باآواز اے۔ جیسے دیر۔ سیر۔ دیکھ میل وغیرہ میں۔

اُردو تحریر میں کچھ حروف اگلے حرف کے ساتھ ملا کر لکھے جاتے ہیں جیسے سب۔ چل۔ سچ۔ بنفشہ میں س۔ چ ب وغیرہ۔ لیکن کچھ حروف علیٰحدہ لکھے جاتے ہیں جیسے اب' دس' ڈر میں ا۔ د۔ ڈ وغیرہ۔ کیا کوئی ایسا اصول بنایا جا سکتا ہے کہ جس سے یہ معلوم ہو کہ فلاں فلاں حروف اگلے حرف کے ساتھ کبھی نہیں ملتے۔ دیگر سب ملا کر لکھے جاتے ہیں؟ ہاں

اصول نمبر ۲۔ لفظ اُردو میں مشمول چاروں حروف (ا۔ ر۔ د۔ و یا ان سے بننے والے دیگر حروف کبھی بعد میں آنے والے حرف کے ساتھ ملا کر نہیں لکھے جاتے۔ باقی سب حروف ملا کر لکھے جاتے ہیں۔ جیسے
(ا) اُردو' میں مشمول حروف۔ اب۔ رس۔ دب۔ ود۔
(ب) ان سے بننے والے دیگر حروف۔ ڈس۔ ڑس۔ آپ۔ دل۔ ڈر۔ ذات۔ پڑا۔ ژن۔ زر۔ زبان۔ ڈال۔
دیگر سب حروف ملا کر لکھے جاتے ہیں۔ جیسے سب کب بین۔ چل۔ تکلیف وغیرہ۔

اس اصول کی وضاحت کے لئے دو مثالیں دی جاتی ہیں۔ (۱) ورزش۔ چونکہ 'و' اُردو میں موجود ہے اس لئے یہ اگلے ر کے ساتھ نہیں ملتا۔ ر بھی اُردو میں موجود ہے اس لئے یہ اگلے ز کے ساتھ ملا کر نہیں لکھا جاتا۔ ز ر سے بنا ہے اور ر اُردو میں شامل ہے۔ اس لئے ز بھی اگلی ی سے نہیں ملتا۔

اس کے برعکس بنفشہ میں ب۔ ن۔ ف۔ ش میں سے کوئی بھی 'اُردو' لفظ میں شامل نہیں اس لئے ان میں سے ہر ایک اگلے حرف کے ساتھ ملا کر لکھا جائے گا۔ یعنی ب ن سے ملے گا۔ ن اگلے ف سے۔ اور ف اگلے ش سے۔ اور ش اگلے ہ سے۔

ہمزہ تحریر میں ہ جماعت کی طرح شکلیں اختیار کرتا ہے اسی لئے ب کی طرح اسے 'ٹ' ایسے لکھنا چاہیئے مثالیں ب جماعت۔ بیٹ۔ ہم۔ بس۔ بیٹی۔ کئی۔ دھوکا آئی۔ تکیہ۔
ٹ ہمزہ۔ رائے۔ دائم۔ دائیں۔ نئی۔ کئی وغیرہ۔ آئی۔ سائکل۔

لیکن یہ (ٹ) ہمزہ آ جماعت کی حرکات (آ۔ او۔ او۔ او) درمیان ایک سادہ شکل 'ء' اختیار کرتا ہے۔ جیسے آؤ۔ پاؤ کو داؤ۔ بوؤ۔ دھوؤں۔ میں ہر ایک ب جماعت سے اختلاف

نوٹ ادارہ:
یہ اس سلسلے کا آخری مضمون ہے۔

ضیاء احمد بدایونی

تبصرے

سراج البلاغت

مولفہ ڈاکٹر قاری سید کلیم اللہ حسینی، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد
قیمت دو روپیہ، شاید جناب مولف سے ملے گی۔

یہ کتاب کا دوسرا حصہ ہے جو صنائع و بدائع کے موضوع پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ جو معانی و بیان سے متعلق ہے شاید ابھی شائع نہیں ہوا۔ کتاب کی ایک بڑی خصوصیت جو اس کو دوسری کتابوں سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ جناب مولف نے ہر صنعت کی تعریف کے بعد اسکی مثالیں تینوں زبانوں عربی، فارسی اور اُردو سے دی ہیں اور نہ صرف نظم بلکہ نثر کی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ مثالیں اخلاقی ... بی اعتبار سے معیاری ہیں۔ زیر نظر کتاب نہ صرف عربی، فارسی اور اُردو کے طلبہ بلکہ اساتذہ کے لئے بھی نہایت مفید ہے۔

تین ہندوستانی زبانیں

از ڈاکٹر کے ایس بیدی۔
ناشر کتب خانہ انجمن ترقی اُردو۔ جامع مسجد۔ دہلی۔
قیمت پانچ روپے۔

اس کتاب میں مصنف نے پنجابی۔ اُردو۔ ہندی تینوں زبانوں کی ابتدا و ارتقا پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے باہمی رشتے کو واضح کیا ہے اور ہر ایک کی عہد بہ عہد ترقی پر بحث کی ہے۔ درمیان میں بہت سے ضروری مباحث و نظریات جو زبان سے عموماً اور زبانہائے مذکورہ سے خصوصاً متعلق ہیں آگئے ہیں۔ آخر میں فارسی، ترکی، عربی، سنسکرت اور انگریزی کے مشترک الفاظ کی فہرستیں دے دی گئی ہیں۔ کتاب پر فنی لحاظ سے رائے تو ماہرین لسانیات کا کام ہے۔ البتہ اس لسانی تعصبات کے دور میں ایک جماعت کو دوسری جماعت کے لسانی مسائل سمجھانے کے سلسلے میں یہ ایک مفید اور عمدہ کوشش ہے۔

کتابیں ملیں

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

کنگ لیئر
مصنف۔ شیکسپیئر
مترجم۔ مجنوں گورکھپوری
ناشر۔ ساہتیہ اکیڈیمی۔ نئی دہلی
سائز۔ ۱۸×۲۲ ۔ صفحات ۱۷۲
قیمت۔ پانچ روپے

ٹکراؤ
مصنف۔ ایم۔ عرفان
ناشر۔ انڈیا لائبریری بک اسٹال جمعراتی بازار بھوپال
سائز۔ $\frac{18\times 22}{16}$ ۔ صفحات ۹۶
قیمت۔ ایک روپیہ

۱۹۶۱ء کا بہترین ادب
مرتب۔ ساحل مانک پوری
ناشر۔ مکتبہ آہنگ، مانک پور (پرتاب گڑھ) یو۔پی
سائز۔ $\frac{20\times 30}{16}$ ۔ صفحات ۲۸۸
قیمت۔ چار روپے۔

یادگار کلثوم (مجموعۂ کلام)
مصنف۔ شہزادی کلثوم
مرتب۔ اکبر جے پوری
ناشر۔ نذیر جان پبلیکیشنز۔ بابا پورہ سری نگر (کشمیر)
سائز۔ $\frac{20\times 30}{16}$ ۔ صفحات ۱۶۰
قیمت۔ تین روپے

مالک انجمن ترقی اُردو علی گڑھ، پبلشر نذیر حسن، پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا